باب ۳

صبح اسلام

(بشارت سورۃ الکوثر)

الاسلام:

اسلام دین فطرت ہے فطرت نمو ہے، فروغ ہے، ارتقاء ہے انسانی وجود میں حیات اسی لئے ہوئی ہے کہ نمو، فروغ، ارتقاء کی تکمیل ہو سکے۔ زندگی کا تقاضا یہی تھا اور اس کے اظہار کے یہی ذرائع۔ جسم میں روح بھی پھونکی اور یہ اَمر ربّی نمو، فروغ اور ارتقا کا ضامن ہوا۔ انسان میں کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِی شَانٍ کا اظہار اسی کے طفیل ہے۔ اس کی اعلیٰ و الطف صفات کو دوام اسی کی روشنی میں ہے۔

كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ ۝ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلَالِ وَالۡاِكۡرَامِ ۝

اسی حیات روح اور صفات ذاتیہ کی بقائے دوام کی طرف اشارہ تھا۔ جس کی تجلّی انسانی وجود کے ذریعہ ہو سکی۔ انسان ہی مرکز وجود تھا، انسان ہی احسن التقویم، انسان ہی خالق کا عظیم شاہکار، محبوب ترین مخلوق۔ ساری مخلوق پر اس کو شرف و فضیلت بخشی گئی۔ مخلوق و ملائک پیدا کرنے کے بعد فرمایا، میں زمین میں اپنا ایک نائب بناؤں گا اور ساری زندگی اسی کے تابع کر دی گئی۔ سب ''کُن'' سے پیدا کیا مگر انسان کو خصوصی انداز میں وجود دیا۔ ارشادات ہیں اسے خود حق تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے بنایا۔ احسن التقویم تخلیق کی اس میں اپنی روح پھونکی اسے فطرت پر پیدا کیا۔ لَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ فرما کر شرف و فضیلت بخشی۔ خلیفۃ اللہ کے لقب سے نوازا۔ سب انسانوں کو ایک ہی راہ توحید پر گامزن کیا گو انہوں نے بعد میں مختلف راہیں اختیار کر لیں۔ ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو تمھارے کام پر لگا دیا ہے۔ میں تمھارے لئے دین اسلام پسند کیا۔ جن و انس کی تخلیق ہی اس لئے کی کہ میری عبادت کریں۔''

دیکھا جائے تو انسان کے وجود سے پہلے ملائک بھی اس کی حمد و تقدیس میں طبعًا لگے تھے، عبادت پر مجبور تھے۔ ذرہ ذرہ اس کی تسبیح کر رہا تھا۔ مگر انسان میں فطرتاً شوق کا جذبہ دے کر آزادی بھی بخش دی۔ قابلیت اصلاح و فساد پر اختیار دے دیا تا کہ

اس کی اندرونی لگن کا اندازہ اس کے اختیاری عمل سے لگایا جاسکے۔اور یہ بھی دیکھا جا سکے کہ وہ کس طرح فساد کے مادہ کو روکتا ہے ورکس طرح اپنی قابلیت اصلاح کا ارتقاء کر کے اسے مجموعی رنگ میں نسلِ انسانی کے ارتقاء کا ذریعہ بناتا ہے۔ خلقت کے ساتھ اس کا یہ اخلاص ہی کلی طور پر اسے خالق کی مرضی ومنشاء کے ساتھ مطابقت پیدا کرا سکتا تھا، تا کہ جو کچھ کرے عبادت کے طور پر کرے اور اس کے کیف سے لطف اندوز ہو کر اپنے شوق کو جلا دے سکے۔ اس رنگ میں اس کی ساری زندگی، عقائد، اخلاق ، معاملات، معاشرت سب ہی جزو عبادت کہلائے ۔فطری قدرتی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے میزان حق و باطل رکھنا انسان کے اختیار میں دیا گیا۔اسے اپنا امین اور نائب بنایا ۔آئین وشرع سے سجایا۔اپنی تمام صفات سے نوازا۔حکمت وعظمت ، تخلیق وتعمیر عطا کی گئیں ۔تا کہ نائبیت خدائی شان کے اظہار میں فرق نہ آئے ۔ساتھ ہی ہوشیار بھی کر دیا کہ نفس وخواہش کے شیطانوں سے راہ کھوٹی نہ کرالینا کہ کہیں خدائی وقار میں فرق آجائے۔حق کی محبت انسانوں کے دلوں میں کچھ ایسی قائم کرا دی کہ جب انہیں آیات یاد دلائی جاتی ہیں ’’تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں‘‘ ۔اپنے پروردگار کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح وتقدیس کرتے ہیں۔ رات کو جب سوتے ہیں تو ان کے پہلو بستروں سے آشنا نہیں ہوتے۔ امید وبیم کے عالم میں کروٹیں بدل بدل کر اپنے پروردگار سے دعائیں مانگتے رہتے ہیں گویا ان کی ساری عبادت یہ ہوتی ہے کہ خدا کے امین ہوتے ہیں۔ان کی روح میں ایک فطری تڑپ ہوتی ہے جو روح کی اپنے اصل کے لئے تلاش ہے۔

اسی تجسس کو بڑھاؤ، تیز تر کرو۔ یہ ذاتِ حق کی تڑپ ہے۔ یہ تڑپ مادی سطح تک رہ گئی یا نفسانی سطح پر بھجا دی گئی تو فروغ وارتقاء کی طرف عروج ختم ہو جات ہے۔البتہ جس نے اس فطری جذبہ تجسس وانہماک کو قائم کرلیا وہی قائم الصلوٰۃ ہو جاتا ہے کیونکہ قائم الصلوٰۃ ہونا یہ بھی تو ہے کہ اپنی فطری صلاحیتوں کو عمل رخ دے کر مختلف سطحات نفسانی، قلبی و روحانی میں قیام عطا ہونے لگے اور بتدریج ارتقائے باطن کی راہ کھلتی چلی جائے۔اور کتاب کا کھلنا بھی باطن میں ہی ہوا کرتا ہے۔ہم نے کتاب کو بھی طاق میں، یا ذہن میں، یا زبان میں محدود کر دیا۔ حالانکہ کتاب فطرت کی کشادگی تو عمل میں ہے۔ اسی کے مطابق عمل پیرائی اسلام ہے۔لہٰذا قرآن پڑھنا نہیں بلکہ ہونا ہے۔ جاننا ہو جانا ہے۔ یہ ہو جانا فطرت کے مطابق عمل پیرائی میں مضمر ہے۔تمھاری تقدیر، تمھاری صلاحیتیں تمھارے لئے آسان کر دی گئیں ۔تب ہی تو تمھارے اعمال طیب ہوئے ،فطری رجحان کے مطابق ہو گئے۔ تمھارے لئے قدرتی اور آسان ہو گئے۔

اب غور طلب بات یہی ہے کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ اسلام کو صحیح طور سے سمجھنا ہوگا بلکہ انسانی زندگے کے ہر شعبہ میں اسے حیات انسانی کا مدد ومعاون، رہنما وہمسفر، مصلح وخیر خواہ بنانا ہوگا۔اسلام کے ہر پہلو کو اسی پیمانے سے عمل پیرا کرنا ہوگا کہ

اس سے فطرت انسانی کی نشوونما، فروغ اورارتقاء ہو۔اگر ایسا نہیں تو یہ اپنی کم فہمی ہوگی نہ کہ اسلام کے اصولوں کی خامی۔ جاننا ہے کہ دین نہ کتاب میں ہے، نہ آئین میں، نہ اصول میں، دین تو عمل پیرائی میں ہے ایک اندازِ فکر وعمل میں ہے جو جمعیت کی خاطر ہوں۔ اسلام کے اصول تو انسان کی خدمت و فلاح کے لئے ہیں کیونکہ انسان خود شاہکارِ خداوندی ہے۔اس سے افضل، اس سے محبوب ترین شے اورکونسی ہوسکتی ہے جب اپنا ہی نمونہ بنا کر انسانوں کو اس دنیا میں بھیجا تو اس سے زیادہ پیارا کون تھا۔ اس پیار ومحبت کی شدّت خداوندی کو پنا کر اگر مصلحین، مفکرین، معلمین، حاکمین ہی کیا، پورے کا پورا معاشرہ ایک توحید فکر میں ہو جائے تو راہیں کشادہ ہونے لگیں۔ ہر فکر، ہر تخیل، ہر عمل کے پیچھے یہی دھن اورلو لگ جائے تو پھر نہ کج روی آنے پائے گی نہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ہوگا، نہ قسمت وتقدیر کی شکایت رہے گی۔ مرضی الٰہی کے ساتھ راضی بہ رضا رہنا۔ یہ نہ ہوگا، کہ جو ہوتا ہے ہونے دو، بلکہ خود دستِ قدرت بن کر قدرت کی اعانت اسی انسان کو کرنا ہوگا۔اسے یہ ضرور دیکھنا ہوگا کہ کونسے عمل اس کے اپنے نفس کے تقاضوں کے تحت ہیں اور کونسے مرضی الٰہی کے تحت۔انسان جب فکر واحتیاط کرے گا تو خودغرضی، حرص و ہوا، خود پرستی، جاہ طلبی، زراندوزی وغیرہ سارے کے سارے شیطانی اور مشرکانہ عمل نظر آنے لگیں گے۔اوران کے مقابلے میں اعلیٰ اقدار، جیسے بے لوث خدمت، ایثار، خلوص، محبت، صداقت، دیانت، امانت، سخاوت، رحمت، عین مرضی الٰہی نظر آنے لگے گی۔اس طرح اَمر ربّی کے اظہاراورعمل پیرائی کا ذریعہ یہی وجود انسانی ہوگا۔نفس، قلب، روح کی سطح پر اس کے ذریعہ انسان اپنے عروج کی طرف قدم رکھے گا۔

مختصراً یوں سمجھ لیں کہ جوعمل اپنی ذات کے لئے نہ ہو وہ بے ریا ہوگا اور جو فلاح عام کے لئے ہو وہ عین حق۔ یہی تخیل، یہی نظریہ انسان میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک عمل آرائی کرتے کرتے بار آور درخت کی تمثیل بن جائے گا کہ انسانیت ہر آن اس کے سائے اور پھل سے مستفیض ہوتی رہے گی۔ یہی وہ عمل صالح ہے جس سے حیات طیب ہو جاتی ہے۔ دستِ قدرت بن کر ہی انسان حَیُّ وقَیُّوم تک رسائی کرسکتا ہے۔خدائی صفات پر عمل پیرا ہوتے ہی ان صفات سے متصف ہوکر عارف باللہ کہلا سکتا ہے۔ یوں اگر انسان اپنے لئے پاکی، طہارت، عبادت، ذکر، اذکار مجاہدے کر کے بھی اپنی 'مَیں' سے نہ نکل سکا تو یہ کس قسم کا عمل صالح ہوا۔اسی فریب سے تو اس کو نکلنا ہے۔اس خود اعتنائی اور جھوٹی تسلی سے تو اس کی راہ کھوٹی ہوتی ہے۔جس میں یہ جمود آگیا اس کی تو موت ہوگئی۔اس میں سے تو وہ شدت حیات، وہ بے چینی وہ تڑپ ختم ہوئی جو عشق ومحبت کی نشانی ہے۔اس جمود اوران زنجیروں سے تو صرف ایک جست ہی انسان کو آزاد کرا سکتی ہے۔ وگرنہ انسان اپنی دنیا وعقبیٰ کی فکر میں سوائے خودغرضی کے اور کیا کرتا رہتا ہے۔سوچو کہ اللہ کو نہ تمھاری نماز کی ضرورت ہے، نہ ریاضتوں ، نہ ذکر و افکار ، نہ

مجاہدوں کی، یہ تو ہر حال میں تم اپنے ہی لئے کر رہے ہو۔ خالصتاً اللہ تو صرف وہی اعمال ہوں گے جو اس کی مخلوق کے لئے نیک دل سے کئے جائیں۔ بھوکے کو کھانا، ننگے کو کپڑا، بیمار کو دوا دارو، ناخواندہ کو علم، دردمند کو ایک میٹھا لفظ۔ یوں انسان بھی تمھارا دیا کھانا کھا کھا کر کہاں تک ارتقاء کر سکتا ہے۔ مگر محبت، خلوص، رفاقت، ہم سفری کر کے تم اس کی تکالیف بھی گھٹا سکتے ہو اس اور اس کے وہم و گمان کو یقین اور ایمان میں بدل سکتے ہو۔ اسے خود اعتمادی دلا کر، اسے خود عمل پیرا کرا کے اس کے مردہ صلاحیتوں کو بیدار کرا سکتے ہو۔ یعنی مادی اور جسمانی سطح پر بھی ہاتھ پیر، دل و دماغ کی کوششوں سے وہ خود نفس پرست بن سکتا ہے۔ مگر تم اسے جیسے ہی اجتماعی فلاح کا رنگ دے دو گے تو اس نفس کے جال سے نکال کر کم از کم لطیفہ نفس کے مقام تک تو لا کھڑا کرو گے۔ اور جب اسے اعلیٰ اقدار سے روشناس کرا دیا، اس کے دل میں محبت کا کوئی کانٹا اٹکا دیا تو پھر قلب کی سطح پر اسے لے آؤ گے۔ محبت کا فطری جذبہ ہر انسان میں موجود ہے۔ اس کے سہارے باطنی خوابیدہ صلاحیتوں اور بھی شدّت سے بروئے کار آجاتی ہیں۔ اس کا ہر عمل محبوب کے لئے ایک نذرانہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ عاشق کو نہ مانگنا آتا ہے، نہ اپنے لئے سودا کرنا، نہ حرص و طمع میں لگے رہنا اس طرح نفس و مادہ پرستی کی دنیا سے بلند ہو کر اگر ہم دیکھیں تو اسلام پیام امن و سلامتی ہے۔ اسلام جمعیت بندی اور فلاحی معاشرہ کو ترتیب اور فروغ دینا ہے۔ اسلام رحمت عالم ہے۔

اسلام دینِ فطرت:

اسلام کو دینِ فطرت کہتے ہیں۔ انسان سے ہٹ کر دیکھیں تو نباتات و حیوانات کی زندگی نمو بھی ہے، حیات بھی، فروغ بھی اور ارتقاء کی دھیمی چال بھی، جو صدیوں میں طے ہوتی رہتی ہے۔ ساری مخلوق ایک دوسرے سے رابطہ میں ہے، ایک توحیدی کیفیت میں ہے۔ انفرادیّت کی انفرادیّت ہے اور اجتماعیت کی اجتماعیت اور گروہ بندی بھی۔ ایک دوسرے کی مدد و معاون بھی ہے اور بظاہر برسر پیکار بھی۔ مگر یہ سب کچھ زندگی و حیات کا سہارا بنی ہوئی ہے۔ سب کچھ التحیات میں ضم ہے۔ تھوڑا سا تفکر کریں۔ یہ جمادات، ان نباتات و حیوانات کو دیکھیں تو ایک سلسلہ حیات ان میں جاری ہے۔ ایک نظام فطرت ان کے پیچھے کار فرما نظر آرہا ہے۔ اور عجب یکتائیت توحید میں، نمو، نشو ونما، تولید، سلسلہ نسل، ارتقاء، اجزا کا پریشان ہونا، عناصر میں ظہور، ترتیب، موت، حیات کس خوبی سے جاری ہے اور کیسے اجتماعی انداز میں۔ یہ اجتماعی انداز ہی توحید فطرت ہے۔ حیات کو دیکھیں تو نہ کوئی چیز فنا ہو رہی ہے نہ کسی شے کو بقائے دوام ہے۔ شکلیں اور صورتیں بدل رہی ہیں۔ حیات کو بقائے دوام ہے۔ کار آمد کو بیکار اشیاء کی جگہ دی جارہی ہے۔

انسان کی بھی اس سطح ارضی پر یہی حالت ہے۔انفرادی اجسام میں بھی یہی کیفیت ہے اوراجتماعی طور سے نظام عالم میں بھی۔ اندر دیکھو، باہر دیکھو حیات ہی حیات ہے۔موت عارضی ہے۔ایک شکل سی بدلنا ہے اور حیات کو دوام ہے۔سب شے فنا ہو رہی ہے۔اور وَجۡہُ رَبِّکَ کو بقاء ہے۔سب غیر حق کی فنا ہو رہی ہے۔ بے کار اشیاء کی فنا ہے اور وجہُ رب کو بقا ہے۔ روح اَمرِ ربّی ہے۔اس کو بقا ہے۔زندگی کی ہر روز نئی شان ہے ہر لحہ نئی آن۔ کیسے جمادات ، کیسے نباتات، کیسے حیوانات۔

تو پھر انسان جو اَحۡسَنُ التَّقۡوِیۡم ہے، جو قدرت کاملہ کا شاہکار ہے، خود قدرتوں سے نوازا ہوا ہے، صفات سے آراستہ کیا ہوا ہے، نائب حق ہے، اس کی کیا شان نہیں۔قومیں آئیں فنا ہوئیں۔تاریکی سے نکلیں، روشنی میں آئیں، پھر تاریکی میں چلی گئیں۔عروج بھی ہوا زوال بھی۔مگر انسانیت پر کیا فرق پڑا۔ناخوب کی جگہ ہمیشہ خوب کو ملتی رہی۔ ہر انسان کے اپنے وجود، جسم، جان، قلب، روح میں یہی فطرت کا اصول اب بھی جاری و ساری نظر آتا ہے جو صدیوں پہلے تھا۔ بچہ اب بھی جہاں پیدا ہوا، اسلام پر پیدا ہوا۔ پوری امن وسلامتی کا پیکر، پورا نائب بن کر فطرت کی معصومیت اور سادگی ہئے۔اپنے اندر جو فطری صلاحتیں ہیں ان کو بغیر توڑے موڑے ان کے تحت زندگی گذارتا ہے۔اندر باہر یکتائیت توحید میں ہوتا ہے۔اسلام کا پہلا سبق توحید ہے۔اس کی عملی تصویر دیکھنی ہو، تو یہی بچہ تو ہے جو کتنا ہی لاچار سہی، معصوم بھی ہے، مختار بھی ہے، نمود فروغ کی شان بھی لئے ہے اور اپنے ارتقائی مدارج کی طرف فطرتاً گامزن بھی ہے۔یہی ہے جو زندگی و تابندگی کا ایک زندہ پیکر بنا ہوا ہے۔تو جب تک یہ فطری نمود، یہ فروغ یہ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ کا انداز انسان میں نہ ہو، وہ کیسے خلیفۃ اللہ اور اَحۡسَنُ التَّقۡوِیم کا مصداق ہو، کیسے دین فطرت کا شاہکار ہو، کیسے توحید ذاتی و صفاتی پر عمل پیرا ہو۔اس فطرت توحید کو تو انسان نے بڑا ہو کر برقرار رکھنا تھا جو قدرت نے اسے پیدا ہونے پر عنایت کی تھی اور جس کا اظہار اس کی بچپن کی زندگی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کی طلب میں شدت کی یک رخی، وہ اپنے جذبات میں شدت کی ہم آہنگی، کہ مانگے تو پورے وجود کے ساتھ، ہنسے تو پورے وجود کے ساتھ، کسی دھن میں لگ جائے تو پورے وجود کے ساتھ، محبت کرے تو پورے پورے وجود سے، نفرت کرے تو پورے وجود سے۔

مگر واہ رے معاشرہ، کہ بڑا ہوتے ہوتے اس کی اس توحید کو کچل کے رکھ دیتا ہے اور بے راہ روی، دھوکہ بازی، دوئی پر اس طرح اسے مجبور کر دیتا ہے کہ اندر کچھ باہر کچھ اور پھر کہلوانا چاہتا ہے کہ کہو اللہ ایک ہے۔سوچو کہ وہ اپنی فطری سادگی اور توحید کھو چکا ہے۔وہ کیا جانے اس ایک کہنے اور اس ایک ہونے کا لطف۔ جوان ہوتے ہوتے وہ حق بینی، حق عملی، حق کوئی تو اس کی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔گویا جب بنیاد دین ہی خام کر دی تو پھر کونسی عمارت ارکانِ دین کی اس پر صحیح بن سکتی ہے۔ وائے افسوس کہ اعلیٰ اقدار زندگی سکھانے کے نام پر اس معصوم کا یہ رنگ کر دیا جاتا ہے۔ستم رسیدہ سے تو کہیں زیادہ فطرت آزادی میں

نباتات، حیوانات پل بڑھ رہے تھے۔ معاشرہ متمدن ہوتو صحیح باغبانی، صحیح گلہ بانی کے انداز بھی تو یہی ہوتے ہیں کہ پودا یا جانور اپنی اصلیت بھی نہیں کھوتا اور ایک تہذیب میں آجاتا ہے جو اس کی نشوونما، فروغ اور ارتقائی منازل کی طرف ترقی کرا کر اس کی اعانت کرتی ہے۔ اسلام بعینہٖ یہی کچھ انسان کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ اسے تو رمروڑ کر، مار پیٹ یا ذلیل کر کے نہیں بلکہ شفقت کے انداز میں اسے تہذیب و شائستگی عطا کرتے ہوئے اس کی فطری صلاحیتوں کو جلا دے کر اس کی نشو نما، فروغ اور ارتقاء کی راہ پر گامزن کرا کے رجوع الی الحق کرانا چاہتا ہے۔ اسلام کی ساری تعلیمات، اسلام کے سارے ارکان اگر اسی نظریئے کے تحت نہ ہوتے تو پھر ذاتِ حق کو انسان کے لئے یہ پیغام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ نگاہِ بصیرت سے دیکھیں کہ اصل قرآن تو انسان کامل ؐ ہے جو اپنی زندگی میں قرآن کی عمل پیرائی پیش کرتا ہے۔ اور جو کاغذ لکھا ہے وہ تو نورانی عکس ہے۔ حیاتِ دین، شعلہ عشق تو اپنے اندر ہوتا ہے۔ یہ لافانی چیز روح کی طلوع فجر ہے۔ فَاُحْبَبْتُ کے طفیل یہ ہر ایک کے قلب و روح میں فطرتاً جاگزیں ہے۔ اسے محبت کی دہائی دے کر اپنے مرکز عشق سے ہم آہنگ کریں تو پھر قران وارد ہونے لگے گا۔

اہمیتِ محبوب:

مگر ہمارا محبوب ہے کہاں۔ سوچو کہ ذات خدا تک کیا پہنچو گے۔ تم جب تعین میں ہوتو تعین میں ہی سے مرکز عشق، ذات محبوب کو پکڑو۔ لاتعین ذاتِ حق تک تو خیال یا عدل سے بھی رسائی نہیں ہوگی۔ جب اپنی غلط فہمی سے نکل کر دین کی روشنی آنے لگے گی تو دیکھو گے کہ حقیقت میں ہمیں اپنے وجود سے زیادہ محبوب شے کوئی نہیں۔ کیا خدا، کیا محبوبؐ خدا اور یہی تو خود غرضی اور نفس پرستی ہے۔ صداقت سے اپنا محاسبہ کرے کہ اس خود پرستی سے کیسے نکلے۔ اور جب لاتعین یعنی ذاتِ حق سے محبت کا دعویٰ کرے تو اس میں صداقت کیسے آئے۔ سوچے کہ ایک تخیّلی دھوکہ اپنے کو دینے سے کیا حاصل۔ آخر ہم کیوں نہیں محبوب مان لیتے اسی ذاتِ مبارک کو جو خود ذات باری کا محبوبؐ ہے۔ کیا خدا سے بھی بہتر کوئی محبوب ڈھونڈ سکو گے۔ کیا خدا کی جو مرضی ہے، جو محبت کی خواہش ہے، اس سے روگردانی کرتے ہوئے اپنے لئے اس محبوب کو چھوڑ کر خدا کو ہی محبوب کہتے رہو گے۔ شیطان نے بھی تو یہی کیا۔ وہ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْن تو خود تمھیں اپنے محبوبؐ کی طرف رجوع کرا رہے ہیں، کہ ان کی جس نے اطاعت کی ہماری ہوگئی، انہیں جس نے چاہا اس نے ہمیں چاہا۔ مومن ہو ہی نہیں سکتے جب تک انہیں اپنے ماں باپ، آل اولاد سے زیادہ نہ چاہو۔ تو کیا اللہ کی نشاندہی کے باوجود بھی تم اپنا رخ ادھر نہ کرنا چاہو گے جدھر اس نے خود تمھارا رخ پھیرا ہے اور ان کی طرف رجوع ہونے کو شرک گردانو گے۔ ارے یہ تو وہ ذاتِ گرامی ہے جن کی اُمّت میں ہونے کی تمنا انبیاء نے کی، جن پر اللہ اور ملائک درود

بھیجتے ہیں۔اس ذاتِ مبارک تک پہنچو۔ان تک رسائی علم کلام سے نہیں، مجاہدوں اورریاضیوں سے نہیں، زہد وتقویٰ سے نہیں، بلکہ سیدھی سادھی محبت سے ہے۔بس عاجزی کو ہاتھ سے نہ دو۔سیدھا سادھا کلمہ پڑھ لو۔ایسا کلمہ جومحبوبؐ کا کلمہ ہوتا ہے، کہ اسی کی یاد اسی کا دھیان، مگر تم تو اسے شرک سمجھتے ہو۔تم آج تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پائے کہ اللہ کو چاہو گے یا اس کے حبیبؐ کو، ذاتِ حق تک اپنی رسائی کرو گے یا مظہرِ حق تک ۔تم اپنے اندر جھانکو۔کیا تمھاری حقیقت کو اور کہاں پاؤ گے۔ان کی محبت کو بھی تو اپنے ہی اندر پاؤ گے۔حقیقت ایک ہی تو ہے۔جان لو کہ باطن کے راہ کھلنے کے لئے محبت کا دوام ضروری ہے۔جسمانی و مادی محبت عمر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔عشق کو دوام اسی وقت ملتا ہے جب مرکزِ حسن کو دوام ہو۔اسلام اسی مرکزِ حسن کی طرف انسان کو رجوع کرتا ہے۔پھر اسی حسن لولاکی، کی تابناکی میں مومن کی زندگی اپنے محبوبؐ کے لئے پائیدار ہوتی جاتی ہے۔اس کا سونا، جاگنا، پھرنا، کمانا،خرچ کرنا، سب محبوبؐ کے نام پر ہوتا ہے۔عاشق عاجز ہوتا ہے۔عجز رحمت کوسموتا ہے۔ایسے پر رحمتوں کے انوار کی بارش ہوتی ہے۔ایسا ہی انسان احسن التقویم ہونے کا عملی ثبوت اپنی زندگی سے پیش کرتا رہتا ہے۔محبوبؐ کے نام پر اسے ساری خلقت سے محبت ہوتی ہے۔محبت کا جذبہ تو ہوتا ہی اس انداز میں ہے جیسا کہ ایک روشنی جو بلا تخصیص سب کے لئے ہو۔محبت اعلیٰ اقدار کو بیدار کرتی ہے۔یہ اعلیٰ اقدار انسان کے اپنے وجود میں تھیں جن کی عمل پیرائی محبت کی تجلّی کے بعد، زندگی کے ہر شعبہ میں پڑنے لگی۔اب ایسے کا ہر کام عبادت ہوگیا۔خالصۃً فی المحبوب ہوگیا۔خالصۃً للہ ہوگیا۔بالآخری یہ رحمت کی طلب میں خود رحمت بن گیا۔خوب فیصلہ کر لو کہ اس رحمت کو اپنے غیب میں پانا ہے۔

ایمان بالغیب:

تم اپنے ہی وجود کو دیکھو۔نہ تم اپنی خواہش سے پیدا ہوئے، نہ تم اپنی موت کا وقت مقرر کر سکتے ہو۔پھر بھی زندہ رہنے کی جوفطری شدت تم میں ہے وہ رحمت بن کر سخت سے سخت بیماری میں تمھاری اعانت کرتی ہے۔تم اپنے وجود میں اسی شفا، اسی رحمت کو آتے دیکھتے ہو۔جب بصیرت آجائے تو مرنے کے بعد بھی اس اندر والی ''میں'' کو یقین ہے کہ ختم ہونے سے رہی اسی ''میں'' کو جب محبوب مل جائے تو اپنے فطری اور قدرتی رنگ میں انسان اپنے وجود تک کو بھول کر محبوب کے لئے جی رہا ہوتا ہے۔اب اپنے غیب میں محبوب بسا ہوتا ہے، جوحقیقت ہے۔ایسے انسان کو مار دو، ٹکڑے کر دو، مگر اس محبوب سے علیحدگی نہیں ہو سکتی۔محبوب جان ہی میں تو ہے۔جسے بصیرت ہوتو دیکھتا ہے کہ یہ اپنے اختیار کی بات کب تھی۔گویا اس نے اپنے کو چاہا۔ایسی محویت کی حالت میں ظاہری جسم کی خواہشات اور عقل کی طلب سے انسان پاک ہوتا ہے۔پاکی اور طہارت تو عشق ہی میں

ہے۔لہٰذا ادھر سے عاجزی اور ادھر سے رحمت کی بارش۔صداقت عشق کے صدقہ اٹھا لیا جاتا ہے۔تب مقام جبروت حاصل ہوتا ہے۔محبوب نے نوازلیا ہوتا ہے۔ انا رُوحی کی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔تب معلوم ہوتا ہے کہ مَیں ' اس جسم کو لئے پھر رہا ہے۔کوئی اور مَیں ' جو اس جسم کو سنبھالے ہوئے ہے اور جسے میں جسم والی مَیں ' سمجھ رہا تھا وہ تو بچپن سے لرکر بڑھاپے تک اپنی صورتیں بھی بدلتی رہی،تصورات بھی،تخیلات بھی۔ وہ مادی 'میں' نشو ونما پذیر بھی تھی اور انحطاط پذیر بھی۔مگر اس اَنا رُوحی والی 'میں' کو قیام ہے۔ یہ 'میں' تجلّی ہے اس رحمت کی جسے رحمت عالم کہتے ہیں۔یہی میں میرے غیب میں ہے اس لئے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کہا گیا تھا۔اسی لئے ایمان بالغیب اسلام کا بنیادی پہلو قرار دیا گیا تھا۔متقی، پاک یعنی عاشق لوگوں کی نشانی بتائی گئی تھی کہ عشق ہی نفس و مادہ وجسم کی طلبوں اور جھوٹی ''مَیں'' کے جنجالوں سے نجات دلا کر حقیقتوں سے روشناس کرا سکتا ہے۔

ایسوں ہی کے قلوب پر قرآن نازل کیا جاتا ہے۔بطن قرآن، اندر والی ایسی زندہ حقیقت ہے کہ ایک ان پڑھ عاشق تک اس کے ایسے رمز کھولتا ہے جس سے تشفی ہو۔سوچیں کہ محبت ہو اور پھر دو زندہ آدمیوں میں ملاقات ہو تو کیسے محبت سے باتیں کرتے ہیں، نہ زمان کا پتہ ہوتا ہے، نہ مکان کا۔ چاہے باتیں بے ربط ہوں تب بھی وہ لطف لے سکتے ہیں۔ یوں صرف فقہ کو دین سمجھ کر، نہیں اور منکرات میں لگ کر حسن قرآن کہاں پاسکتے ہیں۔ جانِ قرآن تو محبوبؐ ہے، اسی تک رسائی کے لئے یہ کلام تھا۔اس احساس زیاں کو لے کر جب بھی قوم محبوبؐ کی طرف رجوع ہوئی تو اپنے قلب کی گہرائیوں ہی میں اس کی محبت کو پایا۔ اپنے غیب کے اندر ہی اس حقیقت کو قوم پاسکی اور اس دنیا میں اپنا مقام حاصل کرتی رہی۔ ان کے لئے محبوبؐ کا رنگ اپنانا سوائے اس کے کیا تھا کہ محبوبؐ کی اُمّت سے اس شدت کی محبت ہو جو محبوب کو اپنی اُمّت سے تھی۔کیا محبوبؐ کی اُمّت سے اس شدت کی محبت ہو جو محبوبؐ کو اپنی اُمّت سے تھی۔کیا محبوبؐ اپنی اُمّت کی اس بدحالی کو دیکھ سکتے تھے۔

مگر جس قوم سے احساس زیاں بھی جارہا ہے،کوئی امید کی منزل یا مقام بھی غائب ہو تو اس قوم میں ایمان بالغیب کیسے پیدا کریں۔حضرت ابراہیمؑ تک کہتے تھے ''ایمان تو ہے مگر دکھاوے'' جب کوئی جانتا ہی نہیں کہ مٹھائی کیا شے ہے تو مٹھائی کی لذت بیان کر کے تھوڑی سی چاشنی بھی اس کے ہونٹوں سے لگا دی جائے تب بھی کیا پائے گا۔تو ایمان بالغیب کے الفاظ سے یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ ایک چیز پر بغیر دیکھے یقین کرنا ہے۔ پھر قرآن بھی یومنون بالغیب پہلی نشانی بتاتا ہے،متقی لوگوں کی۔اس غیب کا کھلنا فتح الغیب ہے۔جس کی طرف غوث پاکؒ نے اشارہ کیا تھا۔ فتح کیا ہے، کھلنا ہے، بندگی کا پردہ اٹھنا ہے۔اب غائب نظر سے دیکھیں تو جسے دیکھا ہے، سنا ہے، وہ غائب نہیں۔اور جو علم سے باہر ہو وہ غائب ہے۔غیب میں نہیں، پردہ میں

نہیں۔لہٰذا غیب وہ ہے جو پر یقین ہو کہ یوں کائنت کی ہر شے، چاہے دیکھی ہوئی،سوچی ہوئی ہو، یا واہمہ میں ہو اس پر گمان ہو سکتا ہے کہ ہے یا نہیں۔اس پر کافی یقین نہیں ہوسکتا۔

البتہ کسی چیز پر یقین کامل ہوسکتا ہے تو وہ یہ کہ 'میں' ہوں 'میں' ہے اس کے لئے کسی گواہی کی ضرورت نہیں، یہ میں ہوں، کیا ہے۔ بچہ تھا تو میں، جوان ہوا تو میں، غیرب تھا تو میں، حاکم بنا تو میں، حتیٰ کہ مرجاتا ہے تو کہتا ہے یہ میری لاش ہے۔ آخر یہ 'میں' ہے کیا کسی نے اس 'میں' کو نہیں دیکھا، مگر ہماری تمام فکر اور تگ و دو اسی 'میں' پر ہے۔ایمان اگر مکمل طور پر ہے تو اسی 'میں' پر ہے جو غیب میں ہے اور یہ ایمان اتنا ٹھوس ہے کہ جاہل ہو یا عالم اسی کے بل بوتے پر زندگی گذارتا ہے۔اسی لئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا تھا مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ اور اسی لئے اپنے سے باہر ڈھونڈنے جاؤ تو کچھ نہیں۔تو گویا عرفانِ ذات کا راستہ اپنے ہی اندر ہے۔اور جسے ذات تک رسائی کہتے ہیں وہ سوائے اسلام کے بزرگان کے کسی کو نصیب نہیں۔ ہماری جیت ہندو حقیقت بینی پر ایمان بالغیب کی ہے ایمان بالغیب مگر جسے نصیب ہو جائے، اس کا کیا مقابلہ۔ کیونکہ اسی ایمان بالغیب کی حقیقت تک پہنچیں تو ذات تک رسائی ہوتی ہے۔اس سے پہلے نہیں۔اور بات کچھ ایسی ہے کہ خود ہی اپنے وجود کے چکر میں گرفتار ہو کر اس حقیقت باطنی سے دور بھی ہو گئے۔

تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

جان لو کہ ذات کی حقیت سے آشنا نہیں سکتا جب تک زمان و مکان سے اسے نجات نہ ملے، خواہ ایک لمحہ کے لئے ہو۔ یوں وجود کے پہلو پر تو زیادہ تر توجہ ہماری ہوتی ہے اور وجود تک ہی ہم اپنا ایمان محدود رکھتے ہیں مگر زمان مکان سے ماوراء ہو کر دیکھو۔اسی طرح نبی کریمؐ کے وجود کے پہلو پر تو ہماری زیادہ توجہ ہوتی ہے لیکن لَوْلَاک کے تصور کو، حقیقت محمدیؐ کو خیال میں نہیں رکھتے کہ وہی کل اشیاء پر محیط ہے۔ رَحْمَتِیْ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ کے انداز میں متفکرون کا یہ انداز بھی پا جائیں۔ لطافتوں کو اپنا کر بھی تو دیکھیں۔

ایمان:

لطافت ایمان کو لیں۔ایمان کیا ہے۔ بظاہر یہی جو نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایمان میری محبت کا نام ہے۔اور جس کی قرآن کریم نے تصدیق کر دی کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک انہیں اپنے ماں باپ، اہل وعیال سے زیادہ نہ چاہے۔تو عشق نبی کریمؐ ہی تمام ایمان کی بنیاد ہوئی۔ پھر کیسے ہوسکتا کہ ہم کسی اعلیٰ کے عشق میں خود اعلیٰ اور الطف نہ ہو جائیں۔ارے

ایمان تو بہت پختہ چیز ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جیسے کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے لئے ثبوت نہیں چاہیے۔ وہ خود بخود چیز ہے۔ یہ وہی چیز ہے۔ اس کی صداقت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ دوئی نہیں ہوتی، محبوب اور طالب، میں البتہ شعوری سطح تک جسے ایمان کہتے ہیں وہ دوئی ہے۔ کیونکہ شعور دوسری چیز کا ہوتا ہے اور اسی لئے اپنے لئے جو علیحدہ ہے وہ دوئی ہے۔ توحید نہیں۔ مثلاً کوئی خیرات دے اور خیال آجائے تو شعور ہے، گھٹیا چیز ہے۔ لیکن وہ نیک اعمال جو بغیر خیال کے خود بخود پھوٹیں وہ الطف ہیں۔ ان کی بنیاد توحید ہے۔ صرف ایسی حالت میں ہی ہمارے ایمان کی سطح توحید ہوتی ہے۔ لہٰذا صداقت یہ ہے کہ جو دل میں بسا ہو وہی ایمان ہے۔

اب اس کی گواہی اَشْھَدُ کہہ کر دی جاسکتی ہے۔ اب ایمان کی مختلف سطحیں سمجھنے کے لئے یہ خیال کریں کہ پہلے محبت، پھر ایمان، شدت سے محبوبؐ پر تصدق، اس کے بعد احسان۔ احسان وہی ہے جو پیر کے صدقے میں، برزخ شیخ اور برزخ رسولؐ کی صورت میں نصیب ہوتا ہے۔ یہ رحمت کا پہلو ہے۔ رَحْمَتِی وَسِعَ کا انداز ہے۔ یہی توحید ہے۔ وحدت کو اگر مصوّر کہہ لیں تو توحید تصویر ہے، وحدت وہی خود ہے۔ اور جب قرآن کی تہہ تک پہنچیں تو توحید ہے۔ حقیقی توحید تو اسی وقت ہے جب وجود کے حبس سے نکلے۔ مگر کون نکلا ہے وجود کے حبس سے۔ یہ روح جو جسم کے حبس کے اندر گھٹتی ہے اس حبس کی کیفیت کتنوں نے لی ہے۔ شاذ و نادر ہی ہوتے ہوں گے جن کی زندگی وجود سے ماوراء ہوتی ہوگی۔ وہ جانتے ہوں گے کہ توحید کیا چیز ہے۔ زمان و مکان سے ماوراء کیا حقیقت ہے۔

ایمان کے بعد احسان ہے۔ برزخ محبوبؐ، یعنی غیب اور حضوری کا رشتہ۔ حضوری کے تصور کے لئے عالم شعور میں جمالِ حسن کا اکمل پیکر لیں تو بات بڑی واضح ہو جاتی ہے۔ وہ ایسا جلوہ ہوتا ہے کہ نہ جلوے کا ہوش، نہ اپنا، یہی تو اپنی حقیقت کو دیکھ لینا ہے کیونکہ ہم جو کسی حسین کی طرف رجوع ہوتے ہیں وہ اپنی طرف سے رجوع ہوتے ہیں۔ معشوق میں دراصل اپنے کو دیکھتے ہیں۔ معشوق آئینہ ہوتا ہے۔ اور حسین کو بھی یہ لطف کہاں مل سکتا ہے جو دیکھنے والے کو، کہ ایک حسین کا سب حسن سلب کر کے جب دیکھتا ہے تب مزہ آتا ہے۔ نہ پلک جھپکی، نہ آنکھ نیچی کی۔ ٹکٹکی باندھ کر دیکھا مازاغ الْبَصَرَ، آنکھوں کی ٹھنڈک، وہ قاب قوسین او ادنی وہ نماز، معراج المومنین۔ وہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ کی زندہ واردات۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ مطلق کیا چیز ہے۔ جب رَاءَیْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ (دیکھا رب کو رب سے) کا اندازہ ہو کر ہوش آئے رب اپنے غیب کے کھلنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ رویت گویا حقیقت محمدیؐ کا ظل تھا جس کے ذریعے تم نے اپنی حقیقت کو دیکھ لیا۔ اور جیسے ہی شعور و فہم کے ذریعہ اس حقیقت کو پانا چاہا تعینات کے پردے پڑ گئے۔ کیونکہ اپنی کوشش، اپنے تخیل، اپنے وجد سے علیحدہ ہی حقیقت آشکار ہوتی ہے۔

غور کریں کہ یہ جو ہم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں پھر بھی اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ پس پردہ کچھ ہے، جو کچھ ہے حقیقت ہے۔ آخر کیا ہے پس پردہ یہ جاننے کے لئے جس حد تک انسان اپنا فنا حاصل کر جاتا ہے اس حد تک انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بعد لاشعور ہے وہبی اور جبلی صلاحیتیں ہیں، کروڑوں سال پرانی۔ اس کے بعد ہی کہیں روح کا مقام ہے جہاں بصیرت حاصل ہوتی ہے، زمان سے آزادی ملتی ہے۔ یہ حاصل ہونے کے بعد واقعات کا رخ یا اسی قسم کی چیزیں صحیح انداز میں آشکار ہوتی ہیں۔

روح کی منازل میں پہنچ کر اپنی انفرادی روح کی شعوری نشو ونما ہوتے ہوتے روح کلی کا وجدان حاصل ہوتا ہے۔ جب یہ عرفان اپنا ہو جائے تو غیب کے پردے اٹھنے شروع ہوتے ہیں۔ مگر وہ ستر ہزار پردوں میں ہے اس تک رسائی پھر بھی کیسے ہو۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے تخیل تک اس کا ادارک ہو جاتا ہے، مگر وصال نہیں ہوتا۔ ادارک اسی کو ہوتا ہے جس کے نصیب میں اس راہ سے گذرنا ہوتا ہو۔ اسی طرح بصیرت حاصل ہو تو دیکھ، لیتے ہیں مگر ہونے میں ہی اصل حقیقت ہے۔ فقراء کہتے ہیں کہ منزل یہی ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ لہٰذا اپنی حقیقت آشکار ہوتی ہے تو انا الحق کہتا ہے اس کے بعد دیکھتا ہے کہ یہ بھی انفرادی ہے۔ اپنا جانِ جان کو کیسے دیکھے۔ حیات کی توحید کیسے پائے۔

لیک کس رادید جان دستور نیست

(مولانا رومؒ)

میں کی حقیقت اور حقیقت عشق

حیات کی پہلی توحید زمان و مکان سے ملتی ہے۔ جب حیات اور زمان مکان کی توحید حاصل ہو جائے تو اپنی توحید حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت 'میں' ایک ہی یکتائیت توحید میں ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ دل کچھ کہہ رہا ہے، دماغ کچھ۔ توحید حاصل ہو جانے کی کوئی حد نہیں۔ کامل ترین ہستی کے لئے بھی او ادنیٰ کہہ کر چھوڑ دیا۔ ابتداء وہیں سے ہے کہ لا ہو۔ پھر سے کچھ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ میں ہے، کہ پڑھنا نہیں بلکہ کلمہ خود ہو جانا ہے۔ البتہ پہنچنا کہاں ہے۔ یہ اپنے اندر کی بات ہے۔ تمھارے اندر کہنا بھی غلط ہے کیونکہ ہم زمان مکان کے پابند ہیں۔ تب ہی حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا ''اے بیٹے تم ام الکتاب ہو، قرآن ناطق ہو، تمھارے اندر ساری کائنات ہے''۔ تو غیب اپنی 'میں' کے سوا کچھ نہیں۔ کہیں آسمان میں نہیں ہے یہ غیب۔ اور ایمان بالغیب یہ ہے کہ اس 'میں' کے سوا کچھ نہیں۔ زینہ بزینہ اس 'میں' کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ تب ہی تو انا الحق

کہہ اٹھتا ہے۔مگر اسلام میزان ہے۔ان تمام چیزوں کے درمیان میزان اورتوازن کےطریقہ سےترقی کریں تو 'میں' کی حقیقت کے انکشاف کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ میں بندہ ہوں۔بندہ کی صفت عجز ہے۔اس لئے شکر یہ وجود میں استغفار کرتا ہے۔

پھر وہی بات آتی ہے کہ یہ اپنے اندر تجسس کی تڑپ کیوں ہے۔یہ سر میں کیڑا کیوں ہے۔ایک تجسس کے بعد دوسرا۔ اس طرح ستر ہزار پردے۔تو یہ عشق کی بات ہے۔روح کی بے تابی ہے اپنے اصل کے لئے۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

(مولانا رومؒ)

اب عشق کی بات یہ ہے کہ ذاتِ مجرد سے عشق کیا جب منتہائے لطافت زمان یا مکان کے ساتھ عشق نہیں کر سکتے تو اس کے ساتھ عشق کیا کرو گے جو الطف در الطف ہے، بے نشان ہے۔ہاں کامل ترین ظہور یعنی نبی کریمؐ سے عشق ہوتا ہے، اگر استاد سکھا دے تب محض اپنے خیال یا جذبات سے یہ عشق پیدا نہیں ہو سکتا۔یہ عشق زندگی کی مشعل کی بات ہے۔ہادی اگر حقیقت کا شہسوار ہو تو توجہ سے اس مشعل کو روشن کرتا ہے۔وگرنہ طریقت میں چنے چبواتے ہیں۔اللہ بہت کچھ دیتا ہے مگر اپنے کو نہیں۔اپنے آپ کو اسی کے ذریعے دے سکتا ہے جو سامنے ہو۔اور وہی مظہر حق ہوتا ہے جو کامل ہو۔حقیقت کا شہسوار ہو، محبوب رب العالمین ہو۔یہ ہم کلمہ کیا پڑھتے ہیں۔اس کی توحید نصیب نہیں ہوتی۔مگر حق بڑا نکتہ نواز ہے۔اسے صداقت چاہیے۔ لگاؤ چاہے، استقامت چاہیے۔اس کے لئے کسی ظہور حق سے عشق کا رشتہ استوار ہو جائے تو بات بن جاتی ہے۔بس انہماک اور دیوانگی سے پیچھے لگے رہیں تو یہ بڑا غیرت مند ہے۔ایک قدم چلو تو میں دس قدم چلتا ہوں۔ذرا سی حرکت میں بڑی برکت ہے۔اسی لئے ''دل بہ یار و دست بہ کار'' بس لاشعور میں وہ بتی جلالیں، کوئی غار میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔شعور اور لاشعور کے درمیان کا پردہ کسی مظہر حق کے دستِ کرم سے ہٹ جاتا ہے۔اب برزخ محبوبؐ میں ہو کر جو خیال آتا ہے وہ روح کی جڑوں تک حتی کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُم تک ہوتا ہے۔یہ ایقان ہے اور حقیقت وہی ہے جو تمھارا ایمان ہے۔جس کا تمھیں حقیقی بھروسہ ہے۔تو مومن کے ایقان کی سطح عشق نبیؐ ہے۔اسی ذاتِ مبارک میں امن ہے، بھروسہ ہے، پناہ ہے اور اپنی زندگی کی چارہ جوئی ہے۔

وائے اسلام و مسلمانی

مگر مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ایمان بالغیب کی لذت سے نا آشنا بھی ہیں اور اس کی حقیقتوں کے ساتھ زندگی گذارنے کا احساس بھی نہیں ہے۔ کیسا ذات مبارک میں بھروسہ اور ایمان ہے، خود اپنے پر سے بھروسہ کھو بیٹھے ہیں۔ زندگی کے میدان میں مرد بن کر زندہ رہنے کا گر کھو چکے ہیں۔ آخر وہ کیا بات تھی جس نے جاہل بدوؤں میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ جس نے ان کے عقیدہ حیات بعد الممات کو اتنا راسخ کر دیا تھا کہ اسلام کے نام پر جان دینے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے تھے۔ وہ کوہ فاران کی چوٹی سے پہلا سبق، اسی آخرت کے عقیدے کی بابت تھا اور فوری طور پر مان لیا گیا تھا۔ وہ کیا بات تھی کہ روز قیامت اور حیات بعد الممات پر یوں ایمان آ گیا تھا۔ حضورؐ کی ذاتِ مبارک ایسی تھی، ان کے ساتھ رہ کر انہوں نے حضورؐ کو امین پایا تھا۔ ان کی امانت وصداقت پر ایمان تھا۔ اسی لئے ان کی غیب بینی تک کو حضورؐ کا ذہنی تخیل یا جذبہ جان کر قبول نہیں کیا، بلکہ اس کو بھی حقیقت سمجھ کر اپنے سینوں میں اتار لیا۔ آج اسی محبوبؐ پر بھروسہ اسی اعتماد شخصیت کی کمی ہے۔ مسلمانوں کا خدا تو غیب میں تھا ہی نبیؐ کو بھی پردہ پس کر کے بھلا بیٹھے ہیں۔ اب علم کو ایمان مان لیا ہے، حالانکہ ایمان تو فدا ہونے میں ہے۔ اب اصولوں کو ایمان جان لیا ہے، حالانکہ اسلام ایک طرزِ زندگی میں ہے، عملی چیز، تخیلی یا جذباتی چیز نہیں۔ اب ارکانِ دین کو گردان لیا ہے، حالانکہ دین کا تقاضہ عشق نبیؐ ہے، جمعیت بندی ہے۔ قرآن کو کتاب شمار کر لیا ہے، حالانکہ قرآن ہونے میں ہے۔ اصل جاننا تو ہو جانا ہے۔ ان سادہ بدوؤں نے کلمہ کیا پڑھ لیا کہ فدا ہو گئے۔ ہر دم اپنے محبوبؐ کا کلمہ پڑھتے رہے۔ مگر آج حال یہ کر لیا ہے کہ اس محبت کے پیمان کو چھوڑ کر قرآن کی سماجی اور معاشرتی تعلیمات کی تفاسیر اور فقہ میں ایسے لگے ہیں کہ مغز قرآن، جانِ قرآن تک کسی کی ہی نظر گئی اور اور حال یہ ہوا کہ احادیث مبارک میں سے ان ہی کی زیادہ تشہیر کی گئی جو اپنے نظریہ خیال کی وضاحت اور دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہیں۔

اب دین کہہ لو، اسلام کہہ لو، قرآن کہہ لو، ان سب کے پیچھے وہی ایک روشن دلیل ہے جسے ایمان کہو، ایقان کہو، ایمان بالغیب کہو، احسان کہو۔ نہ یہ تخیلی وادرا کی چیزیں ہیں، نہ جذباتی، یہ نہ ورد و ظائف سے پیدا ہوتے ہیں، نہ ریاضتوں اور مجاہدوں سے۔ عشق کا ان باتوں سے کیا تعلق۔ عاشق کوئی کتابیں پڑھ پڑھ کر یا غزل گا گا کر تو بن نہیں جاتا۔ یہ جذبہ عشق تو فطری ودیعت ہے انسان میں اور پھونکا سا گیا ہے اس کے وجود میں۔

یہ جذبہ عشق ہی بنیاد حیاتِ کائنات ہے۔ اجسام میں کشش کی صورت میں رونما ہے۔ اور انسان خود مختار ہے۔ اس لئے جیسے ہی اس کا جذبہ عشق جاگا تو اس نے نئے نئے انداز دراندازمیں اس کی رعنائی کی تجلی دکھا دی۔ تو بات لے دے کر وہیں آجاتی ہے۔ یُؤمِنُونَ بِالغَیبِ پر۔ یوں ایمان ہے تو مسلمانوں میں، مگر سرد پڑا ہے۔ باطن کی گہرائیوں میں ہے۔ اسے باہر لانا

ہے تا کہ اس کے سہارے زندگی گذاریں اور مصروفِ عمل ہوں۔ باطن میں ایمان کی موجودگی کا ثبوت بچوں سے ملتا ہے۔ کہ آج بھی وہ اسلام اور کفر کی معرکہ آرائی کا ذکر کرتے ہیں تو کیسے یقین کے ساتھ، وہ اسلام کو کفر پر فتح یاب ہونے کی بات کرتے ہیں۔ اور ان کا یہ رنگ دیکھ کر ماں باپ اور دیکھنے والے بھی خوش ہوتے ہیں، کہ یہ ثبوت ہے کہ جو ایمان بچوں میں ہے وہ ماحول میں بھی ہے۔ مگر خوابیدہ ہے اسے مصروف عمل کرانا ہے۔

پاکستان اور اسلام

جب پاکستان بنا، مسلمانوں کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ اہل نظر دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کا کس طرح استحصال کیا جارہا ہے۔ جناحؒ اٹھے۔ احساس زیاں قوم کو دلایا۔ یہ احساسِ زیاں ہی قوم کو ان کی طرف لے گیا۔ حالانکہ کوئی مثبت چیز مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کی گئی۔ مگر آج تو قوم کا یہ حال ہے کہ احساسِ زیاں بھی نہیں، یہ منفی چیز بھی نہیں۔ اور مہدیؑ کا تخیل قوم کو ایسا دے دیا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے صدیوں سے بیٹھی ہے۔ اور صدیوں تک یوں ہی انتظار میں بیٹھی رہے گی۔ یہ نظریہ بھی سوائے یہودی ذہن کی عیاری کے اور کیا تھا جس نے اسلام کو یوں یہودیوں کی طرح منتظر فردا کر کے ناکارہ بنا دیا۔ آخر اگر مہدی آیا بھی تو آئے۔ تمہاری زندگی کس لئے ہے۔ تمھیں بھی تو کچھ کرنا ہے۔ اس وقت قوم کا یہ حال ہے کہ وعظ سے، لکچروں سے، تحریروں سے، ذہنی طور پر مان لیتے ہیں پھر بھی نہیں ہلتے۔ مصروفِ عمل نہیں ہوتے۔ چین میں لوگوں کو ڈنڈے سے ہلایا۔ مگر ڈنڈے سے ہلانے کے لئے بھی بہت کچھ چاہیے اور کافی وقت۔ کسی قوم کو آگے بڑھانے کے لئے یقین پیدا کرنا ہوتا ہے۔ چین میں کسی نہ کسی طرح یہ عظیم یقین ہے۔ برطانیہ میں جب تک تھا تو بڑی قوم تھی۔ کوئی قائم کردہ رواج کے خلاف کرتا اور اسے یہ بات یاد دلا دی جاتی، تو فوراً رک جاتا۔ مسلمانوں نے اپنی قومیت کا یہ لحاظ بھی کھو دیا۔ اسلام تو ایک جامع مذہب ہے۔ سوچیں کہ یہ مصیبتیں جو آتی ہیں تو کیا ہم مسجد میں گھس کر آیت کریمہ پڑھنے لگیں۔ یہ تو اسلام کے خلاف ہے۔ اس قسم کا فرار۔ یوں نوافل سے اللہ کو اپنی طرف رجوع کرنا یا استغفار سے گذشتہ خطاؤں کی معافیاں مانگنا صرف ایک جزوی پہلو ہے۔ کلّی پہلو میں تو یہ بھی ہے کہ تلوار لے کر باہر نکلنا ہے۔ نبی کریمؐ جو محبوب خدا تھے، تیاری کرتے تھے، تلوار لیتے تھے، باہر نکلتے تھے۔ دل میں یقین تھا ایمان تھا۔

اب ہندوستان سے جو جنگ ہوئی ہے اس کے پس پردہ جو ظلمتیں عالم اسلام کو گھیرے ہوئے ہیں وہ بیان میں نہیں آسکتیں۔ پاکستان تو اس مسئلہ کا ایک چھوٹا سا جزو ہے۔ اسلام کو ختم کرنے کے یہ منصوبے کوئی پانچ سو سال سے ہیں۔ مگر اب

ایسا نازک وقت آیا ہے جیسے پارسیوں کو مسلمانوں نے ختم کیا، بدھسٹ کو ہندوؤں نے کیا، یا اسپین سے مسلمانوں کا نام مٹا۔ سلطنتِ عثمانیہ کی وسعتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے عرب قومیت کو جنم دیا گیا۔ اب پاکستان کو ٹکڑے کر ڈالنے کے لئے علاقائی اور لسانی تعصب کو ہوا دی گئی ہے۔ اب عالم اسلام پر ہر طرف وہ وقت آگیا ہے کہ تمام کوششیں یہود و ہنود و نصاریٰ کی یہ ہو رہی ہیں کہ یہ ملت مٹ جائے۔ ملت کا نام زمانہ سے اٹھ جائے۔ اب ہر اس ملک کو جس نے ہمارا ساتھ دیا گھیرے میں لیا جارہا ہے۔ کوشش یہ ہو رہی ہے کہ نفرتوں کے جذبے ابھار کر آزادی کے نام کی جھوٹی جھلک دے کر، ترقی و خوشحالی کا لالچ دے کر، کسی طرح سے مسلمانوں کے دل سے اسلام کا جذبہ نکال دیا جائے جو تلوار لے کر دینی حمیت و غیرت میں باہر نکل آتے تھے۔ یہی جذبہ تو قوم کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ طرح طرح سے اس جذبہ کو گذشتہ زمانوں میں ختم کرانے کی کوشش ہوتی رہی ہیں۔

ان ہی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے اعمال خراب ہیں۔ حالانکہ اس شکست کا اعمال سے کوئی تعلق نہیں اور ہماری بد اعمالی کا ذکر وہ لوگ کرتے ہیں جن کے خود اعمال پر اللہ رحم کرے۔ جو اپنی ذاتی زندگی میں کچھ ہوں، قوم کے لئے دستِ مفلوج ہیں اور قوم کو ذلیل سمجھنے اور کرانے میں بھی پیش پیش ہیں۔

ارے اس مفلوک الحال قوم کے اعمال تو دیکھتے ہو لیکن نہ اپنے اعمال پر نظر ہے نہ دنیا کے دوسرے لوگوں کے اعمال پر۔ سوچیں کہ بات اعمال کی نہیں ہے، ایمان کی ہے۔ یہ تمھارے اعمال تو ایمان کے تابع ہوتے ہیں۔ مگر آج اس قوم کے ایمان کا یہ حال کرا دیا ہے کہ پوچھتی ہے ایمان کیا ہے؟۔ ایمان کس چیز میں ہے۔ ایمان تو کلی شے ہے۔ نہ صرف اللہ پر، نبی پر، بلکہ ہر چیز پر۔ عالم پر، جمعیت پر، ساتھی پر، اپنے پر۔ اور ایمان کی تعریف ہے ایمان بالغیب، تو یہ کیسے جگایا جائے؟ اس اُمّت میں، ملت میں؟ کیونکہ یہ صرف پاکستان کا سوال نہیں ہے۔ دشمنوں کی چالیں تو یہ ہیں کہ اسلام مٹ جائے، چاہے مسلمان رہ جائیں۔ یہ بہت بنیادی سوال ہے۔ پاکستان کو توڑ کے اس نظریے کی بنا ہلا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب اسلام کو ملی نہیں کہا جارہا بلکہ پنجابی، پختون، مہاجر، سندھی بلوچی، بنگالی، عربی، ایرانی، ترکی، انڈونیشی وغیرہ۔ گویا اجزاء میں اسلام کو منتشر کیا جارہا ہے۔ پیسے سے، عورتوں سے، اقتدار کی ہوس دلا کر انہیں برباد کیا جارہا ہے۔ اس چیز کا تدارک وہی بدوؤں جیسا ٹھوس جذبہ اور وہی سادگی کی لٹک کر سکتی ہے۔ وہ جذبہ ہے، تو داؤ میں نہیں آتے۔

اس سے قبل سنی، شیعہ، قادیانی، وہابی، اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی وغیرہ کی تعریف کی گئی۔ وہ وار نہ چلا تو یہ وار چلایا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان جمعی طور سے اس کا احساس تک نہیں کر رہے اور علماء صوفیا صرف پیوند لگا رہے ہیں۔ جزوی پہلوؤں پر نظر رکھے ہیں۔ حالانکہ مسلمان کبھی دور رس اسکیموں یا فلاحی اسکیموں سے نہیں جاگا۔ ہمیشہ سویا۔ ایک سے اٹھایا تو دوسرے پہلو سو گیا۔ عقیدہ درست کرنے کی کوشش کی تو عمل گیا۔ ارکان دین پر توجہ دی تو جھوٹی خود اعتنائی میں پڑ گیا۔ دین و دنیا کو اسی وقت توازن میں رکھا جب نازک وقت آیا۔ تو اب اس نازک وقت کا احساس ہی دلانا ہے۔

خدا کا ذمّہ اسلام کو بچانے کا یہ ہے کہ اصول زمانہ میں محفوظ رہیں گے۔ مگر یقین واثق کریں کہ عمل بغیر آپ کے ہاتھوں کے نہیں۔ یہ تخیل، یہ نظریہ جمعیت میں کیسے دلنشیں ہو۔ ویسے وقت تو آچکا ہے۔ قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کو قضا کہتے ہیں، قضائے مبرم، وہ تو وہاں سے چھوٹ چکی ہے۔ فروغِ اسلام پاکستان سے ہی ہونا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے اس حقیقت کو اپناتے ہیں اور عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسی کام کے لئے فرشتے یا جن تو آتے نہیں۔ قومی فطری صلاحیتوں ہی کو ابھرنا ہے۔ اٹھنا تو اس شعلہ کو پختون سے ہے۔ اور سندھ میں بڑی جان ہے۔ شاید وہاں پر پہلے ہی اٹھے۔ دونوں جگہوں پر یہ جو مجاہدین جیسے گروہ ہیں اور پچانوے فی صد آبادی ایسے ہی نمازیانِ دین کی ہے، ان ہی میں جان ہے۔ چاہے کتنے ہی درمیان میں منافق بیٹھے ہوں مگر جب یہ ایمان بالغیب فضا میں پھیلے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کچھ شہید ہوں گے۔ کچھ غازی، کچھ انعامات لیں گے۔

صرف ایک بات ہے جو بار بار کہتا ہوں۔ وہ زمانے گئے کہ کوئی ایک شخص، کوئی بھی ہو، وہ زمانہ کا رخ بدل سکے۔ وہ جسے نگاہ سے نقدیر بدل دینا کہتے ہیں، وہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔ وہ نگاہ یَنْظُرُ بِنُوْرَ اللہ ہے۔ اس کو سمائے ہوئے کون ہے، کہاں ہے؟ یوں تھوڑی بہت جس میں روشنی بھی ہے وہ انفرادی حد تک تو کر دیتے ہیں کہ کسی فرد پر تجلّی ڈال کے اسے چونکا دیں۔ مگر قوم کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ نگاہ اپنے قبضے میں نہیں ہوتی۔ بندہ کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ یہ نگاہ انائے کل ہے جو اللہ اکبر کا ظل ہے۔ اور ظِل کے اختیار میں کیا ہے۔ جب وہ نہ ہو تو ظل کہاں، جب وہ ہے تو یہ ہے۔ یوں ظِل ہونا تو بڑی چیز ہے۔

پھر بھی وقت کا تقاضہ تو یہی ہے کہ عمل کی محرک قوّت کسی طرح پیدا ہو۔ خواہ وہ فرد کے ذریعے ہو یا جمعیت کے ذریعہ۔ زمانہ جمعیت کا ہے۔ تو پھر

''من و ساقی بہم سازیم و بخیش را براندازیم''

''میں اور ساقی ساتھ مل جائیں اور فساد کی بنیاد اکھاڑ دیں''

کی پھریری سی سب کے وجودوں میں کیوں نہ سرائیت کر جائے۔ ہم سب نام محمدؐ کی غیرت کیوں نہ بن جائیں۔ اسٹیج تو سیٹ ہے۔ ہر طرف قوم میں جذبہ ہے، چنگاری لگانے کی ضرورت ہے۔ جھنڈا لے کر نہیں نکلنا، مشعل لے کر نکلنا ہے۔ قوم بے غیرت سہی، کمزور نہیں ہے۔ اسے میدانِ عمل میں لانے کے لئے کچھ کرنا ہوگا، یا قربانی دینی ہوگی۔ جب موج آئے تو سب شامل ہوں گے۔ یہ کل کا سوال ہے اور آتش عشق کو کچھ اس طرح بھڑکانا ہے۔

ما آتش عشقیم کہ در موم رسیدیم
چوں شمع بہ پروانہ مظلوم رسیدیم

''ہم عشق کی آگ ہیں کہ موسم میں پہنچے ہیں۔ شمع کی طرح مظلوم پروانہ عاشق تک پہنچے ہیں''

حضرت عثمانؓ کو قوم نے شہید کیا۔ اُمّت کی ظاہری جمعیت بندی گئی۔ نہ پھر یکجا ہو کر نماز پڑھ سکی، نہ جہاد کر سکی۔ حضرت علیؓ نے اپنی شہادت دے کر، قوم کی باطنی حیات کی ضمانت کر دی۔ حضرت حسینؓ نے اپنے ساتھیوں، اپنی اولاد اور اپنی شہادت دے کر، قوم کا باطن پارہ پارہ ہونے سے بچا لیا کہ بنائے لا اِلٰہ ہست حسینؑ، وگرنہ ایک سر کی قیمت لاکھوں کیا، پورا جہان تھی۔ جبکہ جانِ من جان عالم است، کا انداز تھا۔ ان کے بعد شمع نورِ محمدیؐ کو اٹھانے والے امام زین العابدینؒ تھے ورنہ چراغ دین گل ہو جاتا۔ اس روشنی کو جہان میں منور رکھنے میں بھی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کی حسینؑ کی قربانی کی۔ مملکت نورِ باطن میں اسی نورِ محمدیؐ کے حامل زمانوں میں آتے رہے، جنہوں نے یہ چراغ ظاہر باطن میں روشن رکھا۔ ولایت میں سب سے بلند مقام پیرانِ پیرؒ کا آیا جنہوں نے دین کو حیات بخشی اور محی الدین کہلائے۔ ان کے قدم مبارک تمام اولیاؤں کے کاندھوں پر کہ دین میں قیام رہے، بقا رہے، زمین مضبوط رہے، دین کے یہ ستون مستحکم رہیں۔ حضرت معین الدین اجمیریؒ نے اعانتِ دین کر کے اسلام کے چراغ کو سرزمین ہند میں فروزاں کر دیا۔ اب یہ خطہ، خطہ اسلام بھی ہے، خواہ کفر کچھ بھی دعوے کرے۔ وہاں بھی تو مسلمان بس رہے ہیں۔ ان دلوں کی فریادیں کیا عرش پر نہیں پہنچ رہیں۔ کیا اُمّت کے والی کو ان کے دلوں کی پکار نہیں پہنچ رہی؟

مسلمانو! یہ بھی تو دیکھو کہ سُنت نبویؐ کا نچوڑ کیا ہے؟ نبی کریمؐ کیا چاہتے تھے؟ کس کے غم میں وہ آنسو بہاتے تھے؟

پیٹ سے پتھر باندھے رہتے تھے۔معراج میں بھی اُمّتی اُمّتی کی صدا لگی تھی۔اس چاہ کی تھوڑی سی جھلک اگر تمھارے دلوں میں نہیں تو کیسے مسلمان؟ یہ کیا ہم نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں،اراکین دین ادا کرتے ہیں، اس لئے کہ عذاب سے بچیں، جنت ملے۔ارے یہ سوداگری اور خود پرستی نہیں تو کیا ہے۔ہم قرآن پڑھتے ہیں، احادیث پڑھتے ہیں مگر اپنے سے کوئی تعلق نہیں۔تو یہ دوئی ہے، وحدت الوجود کہاں ہے۔قرب کا راستہ نہ ریاضتوں میں ہے نہ مجاہدوں میں ۔قرب کا راستہ محبت ہے۔ جب تک اس وجود کی کثافتیں لگی ہوں تو وہ الطف کیسے قبول کرے گا۔نور کوتو نور ہی قبول کرسکتا ہے۔ جب تک خودمنور نہ ہو کیسے قرب مل سکتا ہے۔آخر محبت کے کیا معنی ہیں۔عبادت یہی کہ معبود کا رنگ آئے۔محبت وہی کہ معشوق کا رنگ آئے۔محبت سے بڑی عبادت کیا ہوسکتی ہے۔محبوب کا رنگ سوائے اس کے کیا ہے جو ایک درد تھا نبی کریمؐ میں اُمّت کے لئے۔مسلمانوں نے اسے نہ اپنایا اور اسے بنیاد دین و حیات نہ بنایا تو پھل پائیں گے۔ نبی کریمؐ کوتو اپنی اُمّت سے اتنی محبت تھی کہ آئندہ آنے والے اُمّت کی اس لئے تعریف وتحسین فرمائی کہ وہ بغیر مجھے دیکھے یہ محبت کا رشتہ قائم رکھیں گے۔ان کے اس ایمان بالغیب کو، جو ذاتِ مبارک سے انہیں ہوگا، اتنا سراہا کہ انہوں نے خصوصی مقام پر اپنے بعد کے آنے والے امیوں کو دیا۔

بشارت سورۃ الکوثر:

حضور سرور کائنات تو قاسمِ کوثر ہیں، بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ ''الرَّحِیْمٌ'' ہیں۔تو کیسی ناامیدی۔مسلمان کیسے ہی سہی، ہیں تو ان کے نام لیوا، ہیں تو ان کی اُمّت ، ہیں تو ان کی اولاد۔تب ہی تو ازواج مطہرات کو''امہات المومنین'' کے لقب سے نوازا۔کفار نے جب یہ کہا کہ آپ کی نسل منقطع ہوگئی اور آپ ابتر یعنی بے نشان ہیں اس لئے آپ کے دین کا چرچا چند روزہ ہے، اور یہ سب دین کے بکھیڑے ختم ہو جائیں گے۔تب حضور حق سے آپ کی تسلی کے لئے کوثر نازل ہوئی۔

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ o فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ o اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ o

یہ مختصرترین سورہ پیام نوید ہے، شادمانی اور کامرانی کی خبر ہے۔

آج کے زمانے میں بھی کفار نے یہی صدا اٹھائی ہے کہ دین اسلام سب بکھیڑا ہے اور بس اب دم توڑ رہا ہے اور اس کا چرچا چند روزہ ہے۔تو ایسے میں رحمتِ محمدیؐ کیسے جوش میں نہ آئے گی۔سنو! پھر سے مژدہ جانفزا اُمّت کو دیا گیا ہے۔سورۃ الکوثر کی تجلی قلوب مومنین پر پھر سے ڈالی گئی ہے۔اپنے قلبوں میں بھی اس تجلی کو پاؤ۔اتنا تو ایمان بالغیب اور بھروسہ رکھ کہ تم جو مسلمان ہوتو اسلام کیسے مٹ سکتا ہے۔اسلام تو سارے عالم کے لئے پیغام بن کر آیا ہے۔اسے تو ابھی تمام عالم میں پھیلنا ہے۔

تب ہی کہیں قیامت آئے گی۔ نورِ حق، باطل کی پھونکوں سے کب بجھ سکے گا۔ سنو! ان کفار کے مفسدانہ نظریات اور اسلام کی ابتری کے اعلانات، اس رحمت کو جوش میں لے آئے ہیں جیسے کوثر عطا کی گئی ہے۔ جیسے فرما دیا گیا تھا کہ تیرا دشمن ابتر ہوگا، ذلیل و رسوا ہوگا۔ آج بھی ملت اسلامیہ دامن شفاعت میں ہے۔ بے آسرا بے سہارا نہیں ہے۔ اس کا دکھ درد رکھنے والا، پائندہ جاوید ہے۔ تم اپنے باطن میں فتح مبین کی تجلی دیکھو۔ سَلَامٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ کا کیف لو۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ کا مژدہ قوم کو دو۔ تمھیں کوثر عطا کر دی گئی ہے۔ یہ غیب کے جاری و ساری خزانے، انعامات اور اکرام ہیں۔ تو اب شکرانہ میں اس غیب کے ساتھ صلوٰۃ قائم کر لو۔ دس بدست شانہ بشانہ رابطہ پیدا کر لو۔ توحید ذاتی قائم کر لو۔ یہ غیب کا رابطہ تمھارے اندر ہے۔ اور یہی حق ہے۔ اس کے بل بوتے پر اپنی ساری فکر و عمل کو دھالو۔ شدّت کار، شدّت انہماک، یک رُخی حق کے ساتھ جذبہ اپنے عمل میں لاؤ۔ اپنی صلاحیتوں کے ان خزانوں کو جو جمعیت کے اندر ہیں، بے حساب ہیں، پوری صداقت اور بے نفسی سے حق کی اس تجلی کے انشراح کے لئے قربان کر دو۔ یہ بے لوث عمل، یہ غم اُمّت شکرانہ کی نماز ہے۔ اور شکرانہ کی قربانی، یہ عمل پیہم کی قربانی، قربِ حق کی نشانی ہے۔ ابراہیمیؑ سُنت قربانی اپنی عزیز ترین شے کی قربانی تھی۔ دعوائے اقرار خلیلیت کی سند تھی۔ لَا اِلٰہَ کی منزل تھی۔ مگر یہ صاحب کوثر کی قربانی کا اندازِ غم اُمّت کو اپنا کر عمل پیہم کی مسرتوں کا اظہار ہے۔ زندگی ظاہر باطن کی جدو جہد میں حیات جاوید اُمّت، اور اس کی کامرانی اور فتح کی خوشی ہے۔ جیسے کہ یہ خود حق کی طرف سے قربانی ہے۔ اہل حق کی قربانی فدائیوں کی عملی قربانی ہے۔ اپنے محبوبؐ کے نشاطِ خاطر کے لئے کیا پیارا انداز ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ اور کیا شان زیبائی ہے۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ جب مجھے آب کوثر سے غسل دیا گیا تو میرا حسن اتنا نکھر آیا کہ میں خود اپنے آپ پر فریفتہ ہو گیا۔ اور جب اس وجود پر آیہ کوثر نازل ہوئی تو حسن عروس جمعیت کی تجلی سارے عالم میں جگمگا اٹھی۔ میں خود اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ پکار اٹھا۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَالْاَبْتَرُ زندگی کا ہر اقدام محبوب کے لئے ذبح عظیم بن جائے۔

قربان جائیں اس شگفتگی پر، جشن منائیں، اس پیغام پر کہ تمھارا دشمن ذلیل و خوار ہوگا۔ ڈھول بجائیں اور منادی کریں۔ زور سے اور زور سے کہ اس کی گونج سارے عالم میں پھیل جائے اور اس کی بازگشت تمھارے قلوب سے کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی تلوار بن کر کفر کے مقابل صف آرا ہو جائے۔

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ؐ o